مطبوعات

عنایات: پروفیسر عنایت علی خاں۔ ناشر: نٹ کھٹ پبلی کیشنز حیدر آباد (پاکستان) سفید کاغذ پر طباعت مناسب، سرورق دبیز چکنا رنگین، صفحات ۱۲۰، قیمت ۳۶ روپے۔

کلی کھلنے کو ہوتی ہے تو زمین اسے تیار شدہ بنا تاتی جوہر دیتی ہے، سورج کی شعاعیں اس کے عروق میں سیّالِ رواں کے لیے قوتِ محرکہ مہیا کرتی ہیں، نسیمِ سحر اسے تقسیم کا ہنر اور نزاکت کی ادائیں اور سبق سکھاتی ہے، شبنم پودے کے پتوں کو دھو دھو کر اس قابل بناتی ہے کہ وہ ہوا میں سانس لے سکیں اور اندر سے آکسیجن گیس خارج کر سکیں، اور یہ عمل پورے نظامِ ہضم کو جاری رکھتا ہے۔

پروفیسر عنایت علی خاں کے مجموعہ کلام کے ساتھ یہی ہوا۔ کلی کھلنے کو تھی، کہیں سے مصارف کا انتظام ہوا، کسی نے کتابت کی ذمہ داری سنبھالی، کہیں طباعت کا بندوبست ہوا، کسی نے سرورق پر مو قلم چلایا، اور اتنی "عنایات" کے نتیجے میں کلی کیا کھلی، گویا پورا گلستان ہی رونما ہو گیا۔ انسانی قدروں کے قسائیوں کے اس زمانے میں ایسے لوگ باقی ہیں جن کے دل کسی شعر کے برگ گل سے کٹ سکتے ہیں۔

پروفیسر صاحب کی شاعری میں سنجیدہ عنصر اور مزاحیہ جزو، دونوں پائے جاتے ہیں۔ سنجیدہ کلام کی ایک مثال ۔

مجھے تو نے جو بھی ہنر دیا، بہ کمالِ حسنِ عطا دیا
مرے دل کو حبِّ رسولؐ دی، مرے لب کو ذوقِ نوا دیا
(حمد)

پوری نظم بڑی شاندار ہے۔

مزاحیہ کلام کی مثالیں ۔

اور اس دولھا کا قصہ آپ نے بھی تو سنا ہوگا اسے جب آر سی مصحف کی خاطر گھر میں بلوایا
کہ لڑکا اندر آئے اور دلہن دیکھ لے چہرا تو دروازے پہ پہنچا اور یہ کہہ کر پلٹ آیا
ذرا یہ ورلڈ کپ ہولے، تو اس کے بعد دیکھیں گے
(ورلڈکپ)

ماتحت افسروں کو مکھن لگا رہے ہیں مکھن لگا لگا کر الو بنا رہے ہیں
تعریف کر رہے ہیں، پانی چڑھا رہے ہیں افسر پھسل پھسل کر شیشے میں آرہے ہیں
مکھن لگاؤ بھیا! مکھن سے کام ہوگا

بیوی اگر ہو خفا مکھن لگا کے دیکھو فرضی محاسن اس کے دو اک گنا کے دیکھو
دو ایک حاشیے پھر ان پر چڑھا کے دیکھو جھٹ مسکرا پڑے گی، تم آزما کے دیکھو
مکھن لگاؤ بھیا! مکھن سے کام ہوگا

کہا جو سیٹھ نے جھلا کے ایک سائل سے کہ اب تو کھال بھی اللہ کے نام دے دی ہے
تو گائے بولی یہ ڈکرا کے ڈپ فریزر سے مجھے تو تُو نے بقائے دوام دے دی ہے
(بقریدے)

"اندیشے" سے بھی لطف لیجئے:

کلمہ پڑھتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہیں اس کو خبر نہ ہو جائے
یعنی ایماں قبول دل سے ہمیں ، وہ "بش" آزردہ گر نہ ہو جائے
(اندیشے)

یہ چند اشعار اس مجموعہ کلام کی پوری لطافتوں اور دلچسپیوں کو سامنے نہیں لا سکتے۔ بہرحال ہماری رائے میں جہاں سنجیدہ کلام میں عنایت صاحب کا رنگ الگ سا نکھر رہا ہے، وہاں ان کے موضوعاتِ مزاح، موادِ مزاح اور طرزِ مزاح شاعری میں دوسروں سے مختلف طرز کا ہے۔ یعنی معاصرانہ نقالی کے عیب سے شاعر پاک ہے۔ (ن ۔ ص)

باعثِ تحریر آنکہ: از پروفیسر افضل علوی ۔ ناشر: فاروق اعجاز (مطبع جسارت پرنٹرز۔ ۲۴ سرکلر روڈ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ اردو ڈائجسٹ ۲۴۔ سرکلر روڈ لاہور۔ صفحات ۲۰۰۔ سفید کاغذ مجلد مع رنگین گردپوش۔

پروفیسر افضل علوی صاحب کو ہمارے حلقۂ ترجمان القرآن کے اصحاب ضرور جانتے ہونگے۔ اب وہ ذرا نئے رنگ میں آئے ہیں' "باعثِ تحریر آنکہ" ان کی مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ایک مقام سے عام سا ایک اقتباس:

"خود ہم نے جب بوڑھا ہونے کا انتظار کیے بغیر صرف ۲۵ سال کے سن میں (یہ سال کا سن کیا ہوا۔ راقم) داڑھی رکھ لی تو یار لوگوں نے ہمیں راہ راست پر لانے کے لیے کوئی پاپڑ سے پاپڑ بیلے کہ ان کا تذکرہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے ---- ہمارے اس شرعی اقدام سے ہمارے گھر والے سہم گئے' اور ہمیں یوں لگا کہ جیسے ہم ان کے کسی کام کے نہیں رہے' تو ہم نے انہیں سمجھایا کہ آپ لوگ بے فکر رہیں' ہم نے داڑھی رکھی ہے' دنیا نہیں تیاگی' زندہ دلی نہیں چھوڑی (جی ہاں! جب کوئی زندہ دل داڑھی رکھ لیتا ہے تو وہ نیم چڑھا کریلا بن جاتا ہے' کیونکہ وہ ادبدا کر کچھ زیادہ ہی مضحکات کے فنی کرشمے دکھاتا ہے۔ راقم) انجمن آرائی ترک نہیں کی' کھانا پینا بند نہیں کیا' لہٰذا یہ تشویش اور پریشانی کیوں' جبکہ ہم وہی ہیں جو کہ تھے۔ کہا گیا "اور تو کوئی بات نہیں' بابا بننے کے لیے عمر پڑی تھی' ذرا کچھ دن اور فیشن ویشن کر لیا ہوتا۔" (ص ۱۴۶--۱۴۷)

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علوی صاحب کا مزاح پھکڑ قسم کا بھی نہیں اور پھوہڑ قسم کا بھی نہیں' بلکہ بہت شریفانہ اور پروفیسرانہ قسم کا ہے۔ یعنی ہلکا پھلکا مزاح' یا پیازی مزاح۔ کاش کہ ہم دوسرے مضامین کی جھلک دکھا سکتے۔ مثلاً: "در مدح خود" "یہ مزے مزے کے مغالطے" "شہر میں کھولی تھی علوی نے دکان سب سے الگ" "ڈاکٹر بھرم بھریالوی" وغیرہ۔

فلیپ پر مجید نظامی صاحب نے ان کی اسلام اور پاکستان سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کو اوّلین مزاحیہ مضمون "درمدح نعرہ" لے ڈوبا (یہ الفاظ میرے ہیں۔ راقم) پھر احباب نے اس مضمون کا پرچم اتنا بلند کیا اور اتنے غبارے اور کبوتر اس کے اعزاز میں چھوڑے کہ علوی صاحب تین چار ماہ میں پورے مجموعے کے مضامین لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ گویا ایک سرچشمہ اندر

بند پڑا تھا وہ یکدم کھلا اور اُمڈ پڑا۔ اب اگر آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہا تو سیلابِ مزاح کے چڑھ آنے کا اندیشہ ہے۔ مشتاق یوسفی اور کرنل محمد خاں جیسے حضرات توجہ کریں۔

مزاحیہ ادب کی صنف فی الحقیقت اصلاح کا بھی لطیف ذریعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے اہلِ صلاحیت کو کام میں لا کر اعلیٰ انسانی و روحانی اقدار کو لمعاں و تاباں کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم آنسوؤں اور خون کے سمندر میں تیرنے والوں سے اگر ماہرین قہقہے لگوالیں تو کونسا کمال ہوا اور حاصل کیا۔ ہنسنے ہنسانے کے بعد پھر وہی آنسو، وہی لہو، وہی لاشیں، وہی انسانیت آزاری، وہی ظلم!

بھئی سنجیدہ تحریر ہو یا مزاحیہ اس فضا کو بدلنے کی سعی کی ضرورت ہے۔ آج کل زمین کے مادی ماحول کی فکر میں اقوام عالم سرگرداں ہیں۔ کسی کو یہ بھی احساس ہے کہ ایمانی، اخلاقی اور روحانی آلودگیاں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ (ن - ص)

آگ، خون اور کشمیر: مصنف: آغا اشرف۔ ناشر: جہانگیر بک ڈپو۔ اردو بازار لاہور۔ سفید کاغذ پر جدید مشینی طباعت۔ صفحات ۳۲۴، مضبوط جلد، جلد پر رنگین طباعت میں منظر کشمیر۔ قیمت ۹۰ روپے۔

میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ وہی آغا اشرف ہیں جن کو میں جانتا ہوں، جن کا مجھ سے ۷۹-۷۸ء میں رابطہ ہوا۔ کتاب کے آئینے میں انہی کی تصویر دکھائی دیتی رہی۔ اور اگر کوئی دوسرے آغا اشرف ہیں تو فنّی و ادبی لحاظ سے یہ بھی کم نہیں۔ اچھے کام کرنے والے لوگ سب اپنے ہی ہیں۔

یہ کتاب بعض جگہ محض بیانیہ بھی ہے، مگر غلبہ ناول کے سے انداز کو حاصل ہے۔ بلکہ اسے ناول ہی کہنا چاہیے۔ یہ ناول کہیں تو واقعاتی تاریخ کا عکس پیش کرتا ہے اور کہیں تاریخ کی تکمیل تھام لیتا ہے۔ یہ ایک جملہ روحِ معنویت کو بیان کرتا ہے: "مجاہدینِ کشمیر کے خون سے آزادی کا سورج طلوع ہونے والا ہے" (ابتدائیہ)۔

پہلا باب جبل پور اور ساگر کے واقعات سے شروع ہوتا ہے۔ اس باب میں برہمن مہاجن سامراج کے آلۂ کار بے شعور ہندوؤں نے جس طرح کے مظالم مسلمانوں پر ڈھائے، جس طرح سرکاری محکمہ ہائے قیامِ امن نے کارنامے دکھائے، جس طرح بات بگاڑ بگاڑ کر پروپیگنڈا کیا گیا۔ عورتوں سے زیور ہتھیائے گئے، مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ خوب کہا: "لاکھوں روپے کی جائیداد کی قیمت ایک دیا سلائی۔" پھر ایک دلچسپ کردار شام بابو کا ابھرتا ہے جس کے ذہن میں "کپکپاتے ہوئے شعلے چیختے رہے۔ چلاتے رہے!" (کپکپاتے ہوئے شعلے کیا معنی، اردو زبان میں

ایسی بات نہیں کہی جا سکتی۔) یہ کردار بھنّا کر کہتا ہے کہ "اقلیت کی ہزاروں مسلمان لڑکیوں کی عصمت کے خون کا قصاص کون لے گا--- کب لیا جائے گا۔" "ان کو جبراً" بیویاں اور رنڈیاں بنانے کا یہ اخلاق سوز مشغلہ کب تک جاری رہے گا؟" اور پھر "متشدد ہندو تنظیموں کے ان راونوں اور راکششوں کو روندنے والا' ان کی وحشت وبربریت کی لنکا کو پھونکنے والا کوئی رام' کیا رام بھومی اجودھیا سے اب کبھی جنم نہ لے گا؟" ---اجودھیا کے رام! تم کہاں ہو؟

"وہ ایک بگولے کی طرح پیچ و خم کھاتے ہوئے پھر کمرے میں چلا آیا اور بستر پر گر کر سسکیاں لینے لگا۔"

دراصل آغا اشرف نے جو مختلف تاریخی ابواب کتاب میں جمع کیے ہیں ان میں سے اس پہلے باب کا مقصد یہ ہے کہ ہندو ذہنیت' ہندو مذہب' ہندو تہذیب اور ہندو کردار کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے جو اپنا آخری روپ کشمیر میں دکھاتا ہے۔ بیچ کے مختلف ابواب میں بھارتیوں کی مسلم کشی کے لیے شہر بہ شہر فسادات کا ذکر ہے۔

دوسرے باب میں بات اجنتا اور ایلورا سے چلتی ہے کہ "آدھی سے زیادہ ننگی نرتکی ناچ رہی ہے"۔ ہندوؤں کا بت پرستانہ اور جنس پرستانہ ثقافتی منظر دکھایا گیا ہے۔ یہاں جو الفاظ اور اصطلاحات استعمال کیے گئے ہیں اور جس طرح کی انسانی ذہنی پستیاں اور جسموں کے کرتب پیش کیے گئے ہیں' وہ ناول نگار کی مہارت کا ثبوت ہیں۔ ثقافتی پس منظر قدیم اور منظر جدید۔ دلچسپ امتزاج ہے۔ یہ باب بڑھتے بڑھتے ہمیں "موت کا لمبا سفر" طے کراتا ہے' تقسیم کے وقت کی انسانی خونخواری کا سرخ سین سامنے آجاتا ہے۔

ہر باب پر گفتگو کرنا مشکل اور اہم ادبی لطائف سامنے لانا مزید مشکل اور دل پر پتھر رکھ لینا اور بھی مشکل۔ مگر ہمارا راستہ مشکل ہے ہی۔ مختصر یہ کہ طرح طرح کے ثقافتی اور تفریحی مشغلوں کے اندر سے بھارت کے لیڈروں اور عامیوں کے ہر طرح کے کردار جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔

"وہ مسلمان تھا' یوسف تھا اس کا نام' وہ کشمیر کا باشندہ تھا۔" بس یہاں سے کشمیر کی داستان خونچکاں شروع ہوتی ہے۔ قصے کا پہلا دردناک دور تقسیم کے زمانے سے متعلق ہے۔ اور دوسرا حال سے۔ بہرحال یوسف مرکزی ہیرو بن جاتا ہے۔ اور جہاد کی کہانی کے لیے ہیروئن شاہینہ قرار پائی ہے۔

"کشمیر میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ انسان ابھی تک صلیب پر لٹک رہے ہیں" ---- "اور صلیب سے ٹپکتے ہوئے لہو کی ہر بوند سے ایلی ایلی لما سبقتنی کی آوازیں بلند ہو کر پوری کائنات میں گونج

رہی ہیں۔"

"آپریشن ناکام رہا --- فلائیٹ لیفٹیننٹ چل بسے۔"

"یہاں آکر ناول ختم ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ پوری کہانی کا خلاصہ' واقعات کے الٹ پھیر' حیرتناک حوادث' مصنف کے خوبصورت جملوں اور وسعتِ معلومات کو بیان کیا جا سکے۔"

مختصر یہ کہ یہ ایک اہم کتاب ہے۔ (ن ۔ ص)

اذان اور دوسرے افسانے: چوہدری غلام جیلانی مرحوم۔ ناشر: عبدالحفیظ' البدر پبلی کیشنز۔ ۲۳ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ سفید کاغذ' طباعت کمپیوٹری' صفحات ۱۹۹۔ سرورق رنگین اور دبیز' قیمت ۴۵ روپے۔

میں جب مدیرِ چراغِ راہ تھا--نئے خطوط پر کام کرنے والا پہلا ادبی رسالہ-- تو لکھنے والے کم تھے' کچھ تیاری کے مرحلے تھے' کچھ کو چراغ راہ اکسا رہا تھا' اور چند اصحاب پہلے سے صاحب مقام تھے (چاہے شہرت نہ رکھتے ہوں)۔ انہی میں سے چوہدری غلام جیلانی تھے۔ یکایک یہ نمودار ہوئے اور مدیر چراغِ راہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے افسانے مہیا کرنے لگے۔ کچھ افسانوں کے ذریعے' کچھ دوستوں کے ذریعے اور کچھ خود جیلانی صاحب کے ذریعے جانا کہ ان کا مطالعہ بڑا وسیع ہے۔ خصوصیت سے وہ فرانسیسی ادب میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ لہٰذا جو کچھ لکھ کر وہ بھیجتے' دیکھ کر جی خوش ہو جاتا۔

یہ مجموعہ ان کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کوئی بھی چیز کچی اور پھسپھسی نوعیت کی نہیں۔ "اذان" چھوٹی سی کہانی ہے' وہ کیا ہی شاندار سبق دیتی ہے۔ ترقی پسندوں نے جب اپنے جھکڑ چلا رکھے تھے' جیلانی کا "اذان" لکھنا گویا اذان کہنا ہی تھا۔ کہانیوں میں مذہبی الفاظ یا عنوانات کا آنا رجعت پسندی کی دلیل قرار دے کر ہر لکھنے والے پر وہ لوگ ایک ٹھپہ لگا دیتے تھے۔ ہم بہت سے ساتھیوں کے ناموں پر انہوں نے رجعت پسندی کے ٹھپے لگا رکھے تھے۔ خدا کے بندوں کی متعصبانہ ذہنیت میں اتنی ذرا سی دراڑ بھی نہ تھی کہ وہ کسی اچھے ادبی افسانے یا پرکشش شاعری کے متعلق یہی کہہ دیتے کہ فنی لحاظ سے خوب' مگر ہمارے فلسفہ کے لحاظ سے مسترد۔ افسوس ہے کہ ایسے تھڑدلے لوگ ہمارے ہاں بڑے انسان سمجھے جاتے ہیں۔ "تحریک" کا ماحصل واقعی یہی ہے کہ "تم عورت کو نہیں سمجھتے۔" "آدھی موت" بڑا اچھوتا خیال ہے اور ایک مبتلائے مصیبت کو ماں کی مامتا بچا لیتی ہے جو دو ڈھلکتے آنسوؤں میں جلوہ گر ہے۔

"موت کب آتی ہے" کا تجزیہ خاصا تفصیل طلب ہے۔ مگر میں مختصراً" یہ کہوں گا کہ جیلانی نے یہاں بھی موت' موت کا قانون اور موت کا فرشتہ پیش کرکے اور گناہوں کی گٹھڑی اور آخرت کا تصور دلا کر نظریۂ اسلامی کی جو خدمت کی ہے وہ تو ہے ہی قابل قدر۔ اس بیان سے فن کہیں زخمی نہیں ہوا۔ لیکن اس نے واقعاتی تجزیہ کاری میں اس سماج کے مروج احوال اور غیرتوں اور عزتوں اور انتقام کے مسائل کو ہمارے سامنے واضح کیا ہے۔ اور موت کا قانون یہ بتا دیا ہے کہ:

> انسان کو زندگی اس وقت تک عطا ہوتی ہے جب تک کہ وہ اپنے لیے اور نوعِ انسانی کے لیے مفید ثابت ہو۔ جب اس کی افادیت ختم ہو جائے۔ اسی وقت اس کی موت آجاتی ہے۔

قرآن نے یہی بات کہی کہ **وَاَمَّا مَا یَنفَعُ النَّاسَ فَیَمکُثُ فِی الْاَرْضِ۔**

"درونِ سینہ و بیرون وے" کا کردار علوم و فنون کی دلچسپیوں میں یکے بعد دیگرے کھو جاتا' مگر پھر بے اطمینانی اسے کسی اور طرف لے جاتی ہے۔ اور آخر وہ مناکحت کی منزل پر پہنچ کر پکار اٹھتا ہے کہ "ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر نامکمل ہے۔" پھر "چور" کا قصہ ہے جو اللہ ھو کی پناہ گاہ میں جا کر بچتا ہے' اور ہمیشہ کے لیے اس کا راستہ درست ہو جاتا ہے۔

"احوبہ" کے تو کیا کہنے۔ مختصر قدیم روایت کے مطابق منجم دو نئے چمکتے ستاروں کے قرب کو دیکھ کر بار بار توجہ کرتا ہے۔ احوبہ جو ایک یہودی رقاصہ کی بیٹی تھی' پوچھتی ہے' کچھ مجھ کو بھی بتا۔ منجم نے کہا: "یہ دو ستارے مل کر ایک شعلہ پیدا کرنے والے ہیں جو جہانِ قدیم و فرسودہ کو خاکستر کرکے ایک نئے جہان کو روشن کرے گا" --- "بیت المقدس کا نور فاران کی جانب ڈھلک رہا ہے۔"

اسکی پوری تشریح کو جاننے کے بعد خاص علامات معلوم کرکے احوبہ مکے کے باہر ایک شاندار قیام گاہ شامیانوں اور خیموں اور قالینوں اور تکیوں' نیز خوشبوؤں اور بہترین مشروبات سے آراستہ کرکے بیٹھ گئی۔ منصوبہ یہ تھا کہ حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ کے ازدواجی ربط کے درمیان ایک خاص مقررہ رات کو وہ حائل ہو جائے۔ یعنی سردارِ مکّہ عبداللہ کو ورغلا بہکا کر ایک شب اپنے ہاں روک رکھے۔ مگر تقدیر کا جو منشا تھا وہ پورا ہوا اور احوبہ ناکام ہو کر غائب ہو گئی۔ اس افسانے میں روایتی حالات قدیمہ کی عجو بگی' الفاظ اور جملے بہت خوبصورت ہیں۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے اور بہت پرلطف۔ اسے تاریخی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ عرفی معنوں میں اپنا رنگ

تاریخی کہانیوں جیسا نہیں رکھتا۔

"دیواروں کے پیچھے" نامی افسانہ جب پہلے پہل سامنے آیا تھا' اس وقت سے اب تک اس کا تاثر باقی ہے۔ ایک تو یہ حقیقت کہ ہمارے ہاں کی گھریلو معاشرت کی بہت اچھی تصویر ہے۔ فضا دیہاتی ہے۔ لڑکی سسرال جا کر جن دقتوں سے دوچار ہوتی ہے وہ بھی بیان ہوتی ہیں اور سلیمہ نے ان حالات میں جن قربانیوں اور دانشمندیوں کے ذریعے کامیابی کا راستہ بنایا' وہ بہت ضروری سبق ہے جو ہر لڑکی کو پڑھنا چاہیے۔

"۱۹۴۷ء میں میرے گاؤں کے چند مناظر" وہی تصویر پیش کرتے ہیں جو عمومی طور پر حالات کی تھی۔ اور آخر میں سخت مراحل سے گزرنے کے بعد بسترِ مرض پر سلیمہ یہ جملہ اپنے شوہر سے کہتی ہے "کہ خدا کو مانے بغیر ہمارا کوئی بھی عمل صحیح نہیں ہو سکتا۔" فضل کریم بھی خاصا مشہور ہوا تھا۔

المختصر جیلانی بی اے نے ثابت کر دکھایا کہ خدا پرستی کا نقطۂ نظر یا اسلامی اقدار کو ساتھ لے کر بلکہ ان کو بنیاد بنا کر بھی ایسے افسانے لکھے جا سکتے ہیں جو فنی لحاظ سے درجہ اوّل کے ہوں' یا کچھ درجہ دوم کے۔ ان کے ہاں درجہ سوم نہیں پایا جاتا۔ (ن ۔ ص)

بقیہ : قرآن کیوں پڑھیں ؟

تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟" (آیت ۔۱۲)

۴۔ "لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔" (آیت۔۱۳)

یہ زرّیں اقوال انسان سازی کے بہترین اصول ہیں اور ایک عمدہ ضابطۂ حیات کے وہ نکات ہیں جن کی روشنی میں ایک صالح سماج کی تشکیل ہوتی ہے اور ہر قسم کی صلاح و فلاح کے راستے کھلتے ہیں۔ عزتِ نفس' شخصی شرافت' باہمی اعتماد و احترام اور صبر و تحمل جیسے اعلیٰ اوصاف پیدا کرنے کے لیے ان اقوال سے بہتر ہدایات ممکن نہیں ہیں۔ جو شخص قرآن پڑھے گا اور اس قسم کی بے شمار آیات پر غور کرے گا اس کے ذہن و کردار کی بہترین تعمیر متوقع ہے۔ (جاری ہے)